مرحلہ درپیش تھا۔ اور بعض تاریخی و تفسیری روایات کے مطابق جبریل امین، خلیل اللہ علیہ السلام کی اِس نازک ترین حالت پر تڑپنے والی کائنات کا نمائندہ بن کر حاضرِ خدمت ہُوا اور "ھل لک حاجۃ" کی تعریض سے مدد کی پیش کش کی تو خُلتِ الٰہیہ میں سرشار اِس مؤحّد اعظم نے کسی تامّل اور ذہنی کش مکش کے بغیر "امّا الیک فلا" جیسے بلند آہنگ جواب سے اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت فرمائی اور اپنی شانِ خلیلی کو اس ہوشرُبا موقع پر بھی توجہ الی الغیر کے شائبے تک سے پاک صاف ثابت کیا۔

خلیل اللہ کا یہ جواب اس حقیقت کی بھر پور غمّازی کرتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام حد درجہ مایوس کن حالات میں بھی کسی قسم کے جذباتی افراط یا بزدلانہ تفریط کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر حال میں ان کی باتیں "مَا یَخْرُجُ منہ الا حق" ؎ کے بمصداق واقعیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس جملے کی ساخت و پرداخت کا بغور مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انتہائی لطیف پیرائے میں اپنی خلقی ضعف و ضرورت کا اظہار بھی ہے کہ "اللہ الصمد" کے بغیر وجود و ہستی کا کونسا فرد ہے جو فقر و احتیاج سے مبرّا ہو اور مومنانہ مقام و مرتبے کا بیان بھی، کہ اخلاص و احسان کی ذائقہ شناسی کے بعد سمیع و بصیر اور رحیم و کریم مالک و خالق کو چھوڑ کر بے بسی و بے چارگی میں ڈوبی ہوئی مخلوق سے استمداد و استعانت زیبا کب ہے۔

؎ امام ابو داؤد اپنی سنن اور امام حاکم مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی علیہ السلام سے جو کچھ سُنتا اُسے لکھ لیتا تھا تو قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ کیا تم نبی علیہ السلام سے جو کچھ بھی سُن لیتے ہو اُسے لکھ لیتے ہو۔ حالانکہ نبی علیہ السلام بھی انسان ہیں خوشی اور غصّے دونوں حالتوں میں باتیں فرماتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ غصّے کی حالت کی بعض باتیں ناگفتنی بھی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ میں لکھنے سے رُک گیا اور پھر کسی موقع پر نبی علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے اپنی اُنگلی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے" ما یخرج منہ الا الحق" یعنی اس منہ سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

بسلسلہ "رسول اللہؐ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کا اندازِ فکر"

مغربی ایمپائر کا قیام

(محترم عبدالقادر جیلانی کے مقالے کی تیسری قسط)

مغرب کی علیحدگی

مغربی سلطنت روما کے اختتام کے بعد مغرب حسب ذیل چھ خود مختار سلطنتوں میں بٹ گیا[1]

۱۔ برطانیہ	اینگلو سیکسن سلطنت
۲۔ شمالی گال	فرینک سلطنت
۳۔ پراونس	برگنڈی سلطنت
۴۔ اکوتانیہ اور اسپین	ویزی گوتھ سلطنت
۵۔ افریقہ اور جزائر بحر روم	وینڈال سلطنت
۶۔ اطالیہ	آسٹرو گوتھ سلطنت

یہ ساری کی ساری جرمن سلطنتیں تھیں۔ ان میں سے کسی سلطنت کے حکمراں نے نہ تو اپنی شہنشاہیت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے تعارض۔ روم کا پوپ اب بھی شہنشاہ بازنطین کو مغرب کا آئینی شہنشاہ تصور کرتا تھا۔ کلیسا کی دستاویزات پر شہنشاہ بازنطین کے سن جلوس کی تاریخ درج ہوتی تاہم عملاً مغرب کا کوئی شہنشاہ نہ تھا۔

بازنطینی شہنشاہ جسٹینین (Gustinian) نے اپنے عہد (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) میں مغربی سلطنت کے علاقوں کی بازیابی کا فیصلہ کیا۔ ۵۳۰ء سے ۵۵۳ء تک بازنطینی افواج نے ایسے تمام علاقے فتح کر لئے جو بحر روم سے متصل تھے تاہم اسے فرینک سلطنت اور اینگلو سیکسن سلطنت فتح کرنے کا موقع نہ مل سکا ——

1 Henry Pirenne.—A History of Europe, P. 30

جسٹینین کے عہد سے مشرقی سلطنت روم کو بازنطین کہا جانے لگا تھا۔ گویا اس عہد کے بعد سلطنت روم (مغربی) بازنطین کا ایک ملحقہ علاقہ بن گئی۔ اس عہد سے قبل "روم" مشرقی علاقے پر حکومت کرتا تھا اور اب خود روم پر بازنطین کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ الحاق بھی عارضی ثابت ہوا۔ جسٹینین کی وفات کے بعد بازنطین امپائر پر روسی علاقے کی وحشی اقوام آوار (Avar) اور سلاف (Slav) نے دھاوا بول دیا۔ دوسری جانب ایشیا میں ایرانی ساسانیوں سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ مغرب پر فوج کشی نے بازنطین کو اس قدر زیر بار کر دیا تھا کہ خزانہ مزید جنگی اخراجات بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ ان حالات نے بازنطین کو مدافعتی جنگ پر مجبور کر دیا اور مغرب کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ بازنطین کی کمزوری سے فائدہ ایک نئے جرمن قبیلے "لومبارڈ" (Lombard) نے اٹھایا۔ اس قبیلے نے گوتھ قبائل کے نقش قدم پر ترک وطن کیا اور شمالی اطالیہ پر قبضہ کر کے لومبارڈ سلطنت قائم کر لی۔ اس نئی سلطنت کے قیام کی بدولت فرینک سلطنت بازنطین کی دسترس سے باہر ہو گئی۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر بازنطین مغربی علاقوں کی بازیابی میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس درمیان ظہور اسلام نے بازنطین کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور مغرب نے اپنے آپ کو بازنطین سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیا۔

لومبارڈ اور فرینک ریاستوں کی پیروی کرتے ہوئے مغرب کے دیگر علاقوں نے بھی بازنطینی اقتدار کا جوا اتار پھینکا۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں اس سیاسی وحدت کا خاتمہ ہو گیا۔ جسے تاریخ "رومن امپائر" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

فاتحین مغرب اور کلیسا

جرمن فاتحین جنہوں نے مغربی رومن امپائر پر قبضہ کر لیا تھا، نیم وحشی تھے۔ انہیں تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مذہبًا بت پرست تھے دریائے ڈینیوب کے آس پاس کے کچھ قبائل اگرچہ عیسائیت قبول کر چکے تھے مگر وہ "رومن کیتھولک" کی بجائے "ایرین" (Arian) تھے۔ مغرب ایرین فرقے کو بدعتی تصور کرتا تھا اور بدعت مغرب

---

1. Henry Pirenne.--A History of Europe, P. 41

کی نظر میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ جرمن فاتحین روم کی تہذیبی برتری کے قائل تھے اور انہوں نے تیزی کے ساتھ رومن تہذیب کو اپنانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ رومن یا لاطینی تہذیب میں رنگ گئے۔ جرمن طور طریقے رومن انداز معاشرت میں گم ہو گئے۔

جرمنوں نے نہ صرف طرز حکومت، اصول سیاست اور انتظام مملکت کو قبول کیا بلکہ کلیسائے روم کی کوششوں سے انہوں نے "رومن کیتھولک" مذہب بھی اختیار کر لیا۔ عیسائی ہونے کے بعد کیتھولک چرچ نے انہیں مغرب کے شہری تسلیم کر کے "عیسائی دولت مشترکہ" (Christian Commonwealth) کا رکن بنا دیا۔[1]

اس طرح یہ نیم وحشی جرمن جو بظاہر فاتح تھے حقیقی فاتح ثابت نہ ہو سکے۔ ان کی تہذیبی موت جلد ہی واقع ہو گئی۔ حقیقی فاتح رومن چرچ ثابت ہوا جس نے ان وحشیوں کو رام کر کے اپنا تابع فرمان بنا لیا۔[2]

مغرب میں کوئی شہنشاہ نہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار برائے نام تھا۔ رومن دور کے قانون ساز ادارے "سینٹ" کو جرمن فاتحین نے نابود کر دیا تھا، اب تمام اقتدار حکمراں کی ذات میں مجتمع ہو گیا۔ مغربی ریاستوں کے سارے حکمراں عیسائی ہو چکے تھے اور پوپ کو اپنا روحانی اقتدار اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ پوپ کے پاس اس کی اپنی سینٹ "کوریا" موجود تھی۔ قریہ قریہ گرجا گھر تھے۔ ہر گرجے کے پادری کا قریبی تعلق عوام سے تھا۔ مذہبی سربراہ کی حیثیت سے پوپ کا حکم بادشاہ پر بھی چلتا تھا۔ جبکہ پوپ بادشاہ کے حکم کا پابند نہ تھا۔ پوپ کا ادارۂ کلیسا مالی اعتبار سے خود کفیل تھا۔ انتظامی معاملات میں خود مختار۔ اس کے سارے کارکن تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے جبکہ حکمراں ان سہولتوں سے عاری۔ رومن سول ایڈمنسٹریشن تباہ ہو چکا تھا۔ جرمن اسے بحال نہ کر سکے۔ عملاً حکومت کا ہر شعبہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ فاتحین نے بے بسی کے عالم میں کلیسا کی طرف دیکھا۔

---

1. Henry Pirenne --A History of Europe, P. 32

2. Toynbee, A.G --A Study of History Vol. II. P. 320

ریاستی نظم و نسق پر چرچ کی بالادستی

کارولنجین (Carolingian) خاندان نے فرینک سلطنت کے نظم و نسق کی بحالی کے لئے کلیسا سے کارکن مستعار لئے اور ایسے تمام عہدے جہاں نوشت و خواند، فہم و فراست، حکمت اور فیصلے کی ضرورت تھی مجبوراً کلیسا کے حوالے کئے[1] کلیسا نے ان عہدوں کو قبول کر کے مغرب کی سیاست کو اپنے تابع کرنا شروع کر دیا۔

رومن کیتھولک چرچ رومن ایمپائر میں سات صدیاں گزار چکا تھا اس دوران اس نے انتظامی ڈھانچہ زبان (لاطینی)، رسم الخط، قانون، رسم و رواج غرضکہ سب کچھ رومن ایمپائر سے مستعار لیا اور یہ ساری قدریں رومن ایمپائر کے زوال کے بعد کلیسا نے محفوظ اور زندہ رکھیں۔ کارولنجین دور میں کلیسا نے ان تمام قدروں کو پھر سے حکومت کے لئے استعمال کر کے ان کا احیاء کیا۔ چونکہ نئے معاشرے کو یہ سب کلیسا کے توسط سے میسّر آئی تھیں اس لئے کرسچین قدریں کہلائیں حالانکہ ان میں سے کوئی بھی قدر کرسچین نہ تھی بلکہ سب کی سب من و عن رومن تھیں۔

کارولنجین عہد سے پیشتر چرچ، ریاست (State) کے تحت تھا شہنشاہ کا حکم چرچ کے معاملات میں بھی حرف آخر تھا جبکہ چرچ کو اسٹیٹ کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس عہد سے مغرب میں یہ کیفیت بالکل بدل گئی یہاں اسٹیٹ کو چرچ کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا جبکہ چرچ اسٹیٹ کے ہر شعبے میں دخیل اور بالادست تھا۔ اس اقتدار اور بالادستی سے مشرقی چرچ بازنطین میں قطعی محروم تھا۔ بازنطین شہنشاہ کے نزدیک پوپ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ دیگر اساقفہ کی طرح پوپ بھی شہر روم کا اسقف تھا جس کے تقرر اور تنزل کا اختیار شہنشاہ کو حاصل تھا۔

مغرب پر جیسے جیسے شہنشاہ بازنطین کی گرفت کمزور ہوتی گئی یورپ کا اختیار مستحکم ہوتا گیا پوپ نے شہنشاہ کی جگہ سنبھال لی۔ وہ مغرب کی عظیم ترین شخصیت بن گیا۔ وہی مغربی حکمرانوں کا رہنما تھا۔ اس کے دم سے مغرب کا نظم و نسق قائم تھا، وہی قانون ساز تھا۔ ضرورت کے وقت سیاسی مدبّر کی حیثیت سے معاہدات

1. Henry Pirenne.—' A History of Europe ', P. 57

کرتا اس کے توسط سے حکمرانوں کے قضیئے طے ہوتے ۔ حملہ آوروں سے شرائط صلح طے کرتا ۔ علاقوں کی مدافعت کرتا ۔ بادشاہوں کے تنازعات طے کرتا ۔

بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کا خاتمہ

مغرب کے نئے معاشرے میں پوپ "نائب عیسٰی" تھا جس کے تقدس کی نظیر روئے زمین پر میسر نہ تھی ۔ مغرب کے عوام اور سب ہی پر اس کا حکم چلتا ۔ ہر حکمراں پوپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت تصور کرتا ۔ ان حالات میں پوپ کے لئے یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار مغرب میں باقی رہنے دیتا ۔ پوپ اگر بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کو باقی رہنے دیتا تو خود اس کا اقتدار مجروح ہوتا ۔ چونکہ ابھی تک پوپ کے وسائل اتنے نہ تھے کہ شہنشاہ سے بغاوت کر کے اس کی دسترس سے محفوظ رہ سکتا لہٰذا پوپ کو موقع کی تلاش تھی اور یہ موقع بھی جلد مل گیا ۔

قسطنطنیہ پر مسلمہ بن عبدالملک نے ۷۱۶ء میں حملہ کیا ۔ دو سال شہر کے محاصرے کے بعد ۷۱۸ء میں مراجعت اختیار کی[1] ۔ اس واقعہ نے بازنطینی شہنشاہ لیو سوم (Leo III) کے وقار کو عالم عیسائیت میں خاصا بلند کر دیا ۔ اس نے نہ صرف فوجی اور ملکی معاملات میں اصلاحات کیں بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ چرچ کی قوتیں کم کر سکے اور عوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے[2] ۔ چنانچہ ۷۲۶ء میں اس نے شبیہہ پرستی (Incanoclasm) کی ممانعت کرتے ہوئے حکم دیا کہ کلیساؤں کو ہر قسم کی تصاویر اور مجسموں سے پاک کیا جائے ۔ شہنشاہ کے اس حکم نے پوپ کو چراغ پا کر دیا[3] اور اس نے شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دیا ۔ پوپ کا یہ عمل آزمائشی تھا ۔ اس سے قبل کسی کلیسا کے سربراہ نے شہنشاہ سے اس قسم کی گستاخی کی جرأت نہ کی تھی شہنشاہ بازنطین

1. Bury, G.B.—' History of the Later Roman Empire' Vol II P. 405.
2. G. T. C. Fuller.—The Decisive Battles of the Western World, P. 241.
3. Ibid, P. 242 and Also, Toynbee A.G. A Study of History, Vol. III, P. 276.
4. Ibid, P. 276 and Henry Pirenne s—A History of Europe, P. 65.

اس لیے عزتی کو برداشت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ مغرب پر اس کا اقتدار برائے نام تھا۔ اطالیہ اس کے قبضے سے نکل کر لومبارڈ حکمرانوں کے زیر تسلط تھا۔ فرنیک حکمران اسپین کے مسلم حملوں کا مقابلہ فرانس میں کامیابی سے کر رہے تھے بشہنشاہ بازنطین کی بے بسی اور فرنیک حکمرانوں کی روز افزوں قوت پوپ کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوئی[1]

مغرب خود مختاری کی جانب | ابتدائی آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنا شروع کیا

اس وقت فرنیک سلطنت پر جو خاندان حکمران تھا اسے میروونجین (Mero vingian) گھرانا کہا جاتا ہے۔ ابتداءً یہ چھوٹی سی ریاست تھی مگر مسلم حملے کے وقت اس کی حدود اسپین سے لے کر ڈینیوب تک وسیع ہو چکی تھیں، فرنیک حکمران اطالیہ پر یلغار کر کے قدم بقدم، لومبارڈوں کو شکست دے رہے تھے لیکن مسلم حملوں نے ان کو جہاں تھے وہیں روک دیا آہستہ آہستہ ان پر زوال آتا گیا۔ میروونجین بادشاہ آخری دور میں بے دست و پا تھے۔ اصل قوت شاہی محل کے حاجب (Mayor of Palace) پپن کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ شخص ایک نیم جرمن نیم رومن، گھرانے — کارولنجین ——— (CAROLINGIAN) سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کے دور میں اس کے بیٹے چارلس مارٹل (Charles Martel) نے کئی جنگیں جیتیں۔ امیر عبدالرحمن الغافقی نے جب ۷۳۲ء میں اسپین سے فرانس میں پیش قدمی کی تو یہی چارلس ان سے "طورس" میں مدمقابل ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اس جنگ کی فتح کا سہرا چارلس کے سر باندھا جبکہ امیر کی شکست مسلم قبائل کی اندرونی رقابت کا نتیجہ تھی[2]۔ اس مفروضہ فتح نے چارلس کو پورے ملک کا ہیرو اور آقا بنا دیا۔

چارلس کے بعد اس کا بیٹا پپن دی شارٹ (Pippian the Short) ۷۴۱ء میں جانشین ہوا۔ اس نے ارباب کلیسا سے تعلقات پیدا کئے اور سینٹ بونی فیس (St Boniface) کے توسط سے پوپ تک رسائی حاصل کی، حالات ایسے

1. Toynbee, A.G. -A Study of History, Vol. II, P. 431.

2. Cesare Folingo Art.—'The Transmission of the Legacy in the Legacy of Rome, P. 14-15.

تھے کہ پین اور پوپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پین عملاً حکمران تھا جب کہ آئینی حکمراں میروونجین گھرانا تھا۔ اسے ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے آئینی حکمراں کی حیثیت دے سکے۔ خود اتنی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ اپنی قوم کے قانونی تاجدار سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ لے۔ اور پوپ میں یارا نہ تھا کہ قابل اطمینان دفاعی قوت کے بغیر شہنشاہ بازنطین کے اقتدار اعلیٰ سے منحرف ہو سکے۔ پین اس ہنگامے سے خوف زدہ تھا جو غاصبانہ تاج پوشی کے سبب قوم میں برپا ہوتا اور پوپ اس فوج سے لرزاں تھا جو شہنشاہ کے اقتدار سے تعارض کی صورت میں بازنطین سے اطالیہ پر نازل ہوتی۔ ہر دو کے مقاصد کی تکمیل ایک دوسرے سے ہوتی تھی اور دونوں ہی نے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

انتقال اقتدار جب راہ ہموار ہوگئی تو ۷۵۱ء میں پین نے پوپ کی خدمت میں ایک سفارت روانہ کی جس نے پوپ سے یہ درخواست کی کہ:-

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ القاب شاہی ایک ایسے شخص سے منسوب کئے جائیں جو حقیقی معنوں میں اقتدار کا حامل ہو اور عملاً اختیارات کو روبکار لاتا ہو نہ کہ ایسے شخص سے (منسوب رہیں) جو صرف نام کا بادشاہ ہو۔"[1]

اس درخواست پر پوپ نے نہایت ہمدردی سے غور کیا اور چند ہفتوں بعد پین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے قانونی بادشاہ کو اپنے باقی ماندہ ایام ایک خانقاہ میں گزارنے کے لئے روانہ کر دیا۔ اس طرح پین یا کارولنجین گھرانے کو اقتدار منتقل کر کے پوپ نے مغرب کو بازنطینی حلقۂ اثر سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور مغرب کی ایک ایسی آزاد ریاست کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ جس کی تمام توانائیاں پوپ کی خدمت کے لئے وقف تھیں۔

ریاست کلیسا کا قیام پین نے پوپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اطالیہ کے لومبارڈ حکمرانوں پر فوج کشی کرے گا اور انھیں شکست دے کر کلیسا کی نذر وہ تمام علاقہ کرے گا جو مقدس شہر روم کے مضافات میں ہے۔ حسب وعدہ ۷۵۴ء میں

1. Henry Pirenne— A History of Europe, P. 77.

لومبارڈ سلطنت پر فوج کشی کی گئی اور انہیں شکست دے کر شہر روم اور اس کے مضافات کا علاقہ پوپ کو بطور نذرانہ پیش کیا گیا۔ اس علاقے پر مشتمل ایک ریاست قائم کی گئی جسے "چرچ اسٹیٹ" (Church State) کا نام دیا گیا۔[2]

قدیم رومن ایمپائر کا پایۂ تخت روم اب بلا شرکت غیرے، پوپ کا پایۂ تخت بن گیا۔ اس ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری بھی پیپن پر عائد ہوئی اور اسے اس ذمہ داری کا پابند کرنے کے لئے "نائب قیصر روم" (Patricius Romonorum) کا خطاب بخشا گیا۔

اقتدار اور تقدس مذہبی

پیپن کی تاج پوشی کے موقع پر جو مذہبی رسوم ادا کی گئیں ان کا وجود اس سے قبل نہیں پایا جاتا۔ اس مذہبی عنصر کی شمولیت نے بادشاہ کے اقتدار کو ایک مذہبی تقدس بخشا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ خدا اور اس کے نائب (پوپ) کا وفادار رہے گا۔ صلیب کو نشان سلطنت مقرر کیا گیا اور پیپن کو "شاہ بفضل رب" (Gratia Dei Rex or King by The Grace of God) کا خطاب عطا ہوا۔[1] اور حکومت عیسائی ضابطۂ اخلاق یعنی کلیسا کے حکم کی پابند ہوئی۔

یہ پابندی بعد کے حکمرانوں کو وراثت میں ملی اور اب مذہب ریاست کا لازمی جزو بن گیا۔ اب صرف عیسائی مغربی معاشرے کے رکن تھے۔ غیر عیسائی یا مذہب بدر (Excommunicated) افراد کی حیثیت باغیوں کی تھی۔ جن کی سرکوبی حکومت اور معاشرے کا فرض تھی۔

مغرب شہنشاہیت کی جانب

۷۲۶ء میں پوپ نے بازنطینی شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دے کر بازنطینی اقتدار کا مذاق اڑایا۔ ۲۵ سال بعد ۷۵۱ء میں کلیسا کی، کاسہ لیس حکومت قائم کر کے بازنطین کے متوازی ایک رقیب سلطنت کھڑی کر دی۔ تو اب اس کا مطمح نظر شہنشاہیت تھا۔ پیپن کے بعد اس کا بیٹا شارلمین تخت نشین ہوا۔ شارلمین اعظم کو جو شہرت میسر

---

2. Fuller J.F.C.—'The Decisive Battles of the Western World' P. 243.

1. Henry Pirenne 'A History of Europe', P 78.

آئی دہ اس سے قبل رومن ایمپرر، سیزر کو یا اس کے بعد صرف نپولین کو ملی۔

شارلمین جب ۷۶۸ء میں تخت نشین ہوا تو مذہب معاشرے کی سب سے بڑی قدر بن چکا تھا۔ شارلمین کے عہد میں کلیسا کے احکامات کو ملکی قوانین کی حیثیت ملی۔ عیسائیت کو بزورِ شمشیر جرمن قوم سیکسن میں پھیلایا۔ رومن کیتھولک معاشرے کی حدود دریائے ڈینیوب تک وسیع کیں۔ ڈینیوب کے علاقے میں بسنے والی ایک قوم آوار (Avar) کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ پھر سلاف (Slav) قوم کی طرف متوجہ ہوا۔ تو اسے بری طرح منتشر کیا اور اسکو کثرت سے گرفتار کیا کہ یورپ میں لفظ (Slave) کے معنی ہی غلام کے ہوگئے۔ اس نے جس علاقے میں بھی فتح حاصل کی وہاں بزورِ شمشیر لوگوں پر رومن عیسائیت مسلط کی۔ ان لوگوں کے لئے جو عیسائیت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے موت کی سزا مقرر کی۔[2]

شارلمین نے مسلم اسپین پر بھی حملہ کیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد ناکامی کا داغ لے کر لوٹا۔ شارلمین کی تمام مہمات کلیسا کے مفاد میں تھیں خصوصاً لومبارڈ قوم پر حملے، اسپین کی مہم اور سیکس قوم کی تباہی میں صرف کلیسا کا مفاد کارفرما تھا۔ ان مہمات کے نتیجے میں پورا مغرب رومن کیتھولک چرچ کے حلقۂ اقتدار میں آگیا اور یہی خدمات تھیں جن کے باعث کلیسا نے شارلمین کو شہرت دوام بخشی۔ یہ شارلمین تھا جس نے مغرب کی سیاست کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھ میں دے دی۔

شارلمین کی خدمات ملک اور مذہب کے لئے کچھ کم نہ تھیں۔ سونے پر سہاگہ اس نے پوپ کی ذات پر بھی ایک احسان کیا۔ اپریل ۷۹۹ء میں پوپ لیو سوم (LEO III) پر زنا کی تہمت لگائی گئی نیز دروغ گوئی اور دروغ حلفی کے الزامات بھی عائد کئے گئے۔[3] پوپ نے فرار ہو کر شارلمین کے دربار میں پناہ لی۔ شارلمین نے اسے دوبارہ تعینات کرکے روم واپس کیا اس پر پوپ کے مخالفین مشتعل ہوگئے۔ چنانچہ ۸۰۰ء میں

---

1. TOYNBEE, A.J 'A STUDY OF HISTORY', VOL II P.167
2. Henry Pirenne, 'A History of Europe, P 80. Also Shaw, B. 'Shaw on Religion' Edited by Warren Smiths, P. 141.
3. FULLER J.F.C. 'The Decisive Battles of Western World' P.245

شارلیمن اس قضیے کو نمٹانے خود روم پہنچا اور معاملات رفع دفع کئے۔ ۸۰۰ء کرسمس کی عبادت میں شرکت کے لئے وہ سینٹ پیٹر کے گرجا گھر میں حاضر ہوا۔ ابھی وہ قربانگاہ پر دوزانو ہوا تھا کہ لیو نے قربان گاہ پر سے ایک تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نعرہ بلند کیا۔

Hail to Charles Augustus Crown of God. the Great and the Peace Bringing Emperor of the Romans.

تاج پوشی کے بعد لیو نے ان آداب شاہی کے ساتھ اس کی شہنشاہیت کا اعلان کیا جو صرف بازنطینی شہنشاہ کے لئے مختص تھے۔

اس طرح حضرت عیسٰی کا یوم پیدائش "ویسٹرن ایمپائر" کا یوم تاسیس بن گیا۔ چونکہ یہ مغربی شہنشاہیت سینٹ پیٹر کے مقدس جانشین کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی اس لئے اس کا نام "مقدس رومن سلطنت مغرب (Holy Roman Empire of the West)" رکھا گیا۔[1]

اس طرح کلیسا نے مغرب کو سلطنت بازنطین سے علیحدہ کیا۔ مغربی معاشرے کی اپنی نگرانی میں نشوونما کی۔ اسے ایک شہنشاہیت کا درجہ دیا اور اسے رومن ایمپائر کا جانشین بنایا۔ یہ ایسی ایمپائر تھی جس کا شہنشاہ پوپ کی قدم بوسی کرنے میں فخر محسوس کرتا۔ جو کلیسا کی حفاظت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے وقف تھی اور جس کی باگ ڈور پوپ کے ہاتھ میں تھی۔

مغرب کا معاشرہ

یہ معاشرہ مذہباً کیتھولک عیسائی تھا اور اس نے عیسائیت کو رومن دور میں قبول کیا تھا لیکن یہ عیسائیت خالص رومن عیسائیت تھی اور سرتا سر ہیلینک اثرات کی

1. Fuller, J.F.C. The Decisive Battle of the Western World, P. 246.

2. Arnold, Sir Thomas. The Legacy of Islam, P. 41.

یہی تو میں جنہوں نے اپنی ملکی حدود سے باہر کی دنیا کو غلامی کا تحفہ دیا، اور سب کے سب مغربی سوسائٹی کے ارکان ہیں - اس لوٹ میں یورپ کے کسی غیر مغربی معاشرے کیلئے کوئی گنجائش نہ پیدا ہونے دی -

مغرب اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کو عامی تہذیب اور عالمی تاریخ کا درجہ دیتا ہے، جو صرف خوش فہمی ہے - اگر وہ اپنی تہذیب تاریخ کے سوا باقی تہذیبوں اور تاریخوں کو عالمی کہے تو اس میں ضرور وزن پایا جائے گا۔ اپنی تہذیب کو دوسروں پر فوقیت دینا محض احساس برتری کا اظہار ہے ورنہ دنیا کی زندہ تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب ہے جو باعث افتخار نہیں - ہر تہذیب اعلیٰ ادار ثقافتی خطوط کی حامل ہے۔ مشرقی آرٹ، فلسفۂ چین، فکر اسلام اور حکمت ہند سب نے اپنی تہذیبوں کے سر بلند مینار ہیں۔ لیکن مغرب بیک جنبش قلم ان سب کو بغویت قرار دیتا ہے۔ یونانی معاشرہ کا احترام بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے حالانکہ مغرب کے لئے یونانی تہذیب عرصے تک سرمایۂ افتخار رہی ہے۔ مغرب اگر کسی غیر مغربی تہذیب کا ذکر کرتا ہے تو تمسخر کے ساتھ اور اگر اپنی تہذیب پر آنچ آتے دیکھتا ہے تو دنیا کی دوسری اقوام کو تباہ کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ مغرب کی تمام اقوام ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں اگر ایک مشترک نام دیا جائے تو وہ "نارڈک مین" (Nordic Man) کہے جا سکتے ہیں -

نارڈک لوگ شمالی یورپ کے اصل باشندے تھے۔ بھورے بال اور نیلی آنکھیں۔ زمانہ ما قبل تاریخ سے یہ لوگ اپنے نارڈک علاقے سے منتقل ہو ہو کر جنوب کی طرف آتے رہے - انہوں نے بحر روم کی کمزور اقوام پر اپنی حکومت قائم کی قدیم رومی، قدیم یونانی، جرمن، فرنیک سب کے سب نارڈک تھے - جسمانی ساخت اور زبان کے اعتبار سے ہندوستانی آریوں سے مشابہ ہیں اس لئے انہیں "ہند اورپائی" (Indo Europian کہا گیا ہے -

چونکہ ہند اورپائی نسل زندوں نے فاتحین کی حیثیت سے مشرق و مغرب ہر طرف ساری دنیا کو زیر نگیں کیا تھا اس کی حکمرانی کی - یہی وہ نسل تھی جس نے زرتشت،

A J Toynbee A study of History P 156 Vol. I 7th Edn England 1956

مہاتما گوتم بدھ، سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے مفکر پیدا کیے۔ سکندر، دارا، سیزر اور آگسٹس جیسے فاتحین اس میں گزرے، اسی نے سیاسی عظمت روما کی تشکیل کی۔ اسی نسل کے طفیل دنیا نے تمدن اور ثقافت [illegible] یہ نسل باقی نوع انسانی سے افضل ہے [illegible] یورپ کو اتفاق تھا لیکن جب قومیت کے جذبے نے جنم لیا تو [illegible] اقوام [illegible] اور خصوصاً جرمنوں نے شدت کے ساتھ اس میں [illegible] پیدا کی [illegible] کو "انڈو جرمانک" اصطلاح [illegible] دیا [illegible] اس نظریے کی دیوانگی میں اضافہ کیا اور بالآخر پورا مغربی معاشرہ [illegible] احساس برتری کا شکار ہو گیا۔

ہوسٹن اسٹوارٹ چیمبرلین (Houston Stewart Chamberlain) نے [illegible] کی [illegible] تہذیب۔ ہر عظیم شخصیت اور ہر عظیم کارنامہ کو نارڈک [illegible] سے منسوب کر ڈالا۔ وہ صرف نپولین اور ڈانٹے کو نارڈک ثابت بنانے پر مطمئن نہ ہو سکا بلکہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بھی اس میں شریک کر کے دم لیا۔[1] غرضکہ نارڈک [illegible] نظریہ ایسا [illegible] تھا جو ہر سفید آدمی کو کندن کر دیتا ہے۔

نسلی برتری کا یہ تصور مغرب کو دیگر سفید فام اقوام پر کوئی خصوصی برتری نہ دیتا تھا۔ اس نے انسان کو سفید فام اور رنگدار گروہوں میں تقسیم کر دیا اور تقسیم کا یہ نظریہ وسط انیسویں صدی میں عام ہوا۔ پندرھویں صدی تک مغرب میں انسان کی تقسیم ایک دوسرے انداز سے کی جاتی تھی۔ یہ تقسیم عیسائی اور بے دین کی تھی۔ (Christians and Heathen) قدیم تقسیم جدید کے مقابلے میں قدرے بہتر تھی کیونکہ اس میں دیگر نسلوں کو عیسائی ہونے کے طفیل کچھ نہ کچھ مساوات میسر تھی۔ مغرب میں تقسیم کی یہ شکل اب [illegible] ہو گئی۔ نسلی تفاخر نے کردار اخلاق اور مذہب کی قید [illegible] رنگ کو معیار برتری بنا دیا۔ کیتھولک عیسائی کی قدیم شرط نے مغرب کو دیگر [illegible] قوموں پر اپنی برتری جتانے کا موقع دیا۔ قدیم عیسائیت کی نظر میں عالم عیسائیت کے [illegible] بے دین اور گمراہ تھی مگر ایسی نہ تھی جو راہ راست پر نہ لائی جا سکے۔ ایسی

1. Toynbee A. J. A Study of History, [illegible]
London 1956

اچھوت نہ تھی جسے پوتر نہ کیا جا سکے۔ ان کو اچھوتوں کو دوبارہ پرلانے کی امید اور نہ توقع تھی لیکن نسلی تفاخر نے بقیہ دُنیا کو اچھوت سے بدتر کر دیا۔ تاہم اس تفاخر میں فرانس وہ واحد ملک اور قوم ہے جس نے دیگر مغربی ممالک کا ساتھ نہ دیا وہاں معیارِ تفاخر رنگ نسل و مذہب کی بجائے صفات انسانی کو تسلیم کیا گیا۔ وہاں انسانیت کی تقسیم صاحبِ صفات اور محروم صفات کے دو گروہوں میں کی جاتی ہے[1]۔

رنگ صرف نارڈک مین کا معیار ہے جو اسے دُنیا کے دیگر انسانوں سے ممیز کرتا ہے ورنہ دیگر ممالک میں رنگ معیارِ مفاخرت نہیں۔ ہندوستان میں ذات پات معیارِ مفاخرت ہے۔ برہمن اور چھتری چاہے جس رنگ کے ہوں، ممتاز ہیں۔ جاپان میں لوگوں کے رنگ زرد، سُرخ، سفید ہر طرح کے ہیں مگر وہاں بھی رنگ معیارِ مفاخرت نہیں نیز نسل بھی عالمی معیار افتخار نہیں یہ معیار بھی بدلتا جاتا ہے۔ چین اور جاپان میں نسلی نجابت کا معیار جسمانی بال ہیں۔ جس کے جسم پر جس قدر کم بال ہیں وہ اتنا ہی نجیب متصور ہوتا ہے۔ بالوں کی زیادتی کمتر نسل کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک معیارِ تمیز انسانی جسم کی بو ہے۔ دورِ وحشت میں انسانی جسم سے شیر اور چیتوں جیسی بدبو آیا کرتی تھی اس قسم کی بدبو کا ہونا بھی دورِ وحشت سے قربت کی دلیل ہے۔ مغربی افراد کے جسم کی بو غیر مغربی بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے جبکہ مغربی فرد خود بمشکل محسوس کر سکتا ہے۔

غرضکہ مغرب کی نسل پرستی میں جو بھونڈی سنگدلانہ اور سستی خود پرستی پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل کسی تہذیب میں نہیں پائی گئی اور عصرِ حاضر نے اس کی معرفت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی مذمت شروع کر دی ہے یونانیوں کو بھی اس کا سہارا لینا پڑا تھا لیکن ان کے فلسفۂ نسلی برتری میں عقلیت، اخلاق، مروت اور [illegible] کی شان بھی پائی جاتی ہے۔

رنگ و نسل کے امتیاز کے ساتھ مغرب کو روم سے ایک عقیدۂ دوام بھی ملا رومن دُنیا اپنی تہذیب، اپنے ملک اور قوم نیز مذہب کو لافانی تصور کرتی تھی۔

---

1. Taylor Griffith 'Environment and Race. P 33 · Oxford University Press 1927

لافانی شہر روم

قدیم شعراء مثلاً ٹائبلس (Tibullus 54 - 18 BC) کے قصیدے تک پڑھتے چلے آئے ہیں۔ جیک ورجل نے لکھا ہے۔

"میں تجھے سلطنت بے انتہا عطا کرتا ہوں"[1]

(I give you The Empire without End)

لیوی نے اسی یقین کے ساتھ روم کو ابدی شہر لکھا[2]

(The City Founded for Eternity) اس معاملے میں مسیحی اہل فکر بھی بت پرستوں سے پیچھے نہ تھے۔ وہ بھی روما کو لافانی تصور کرتے تھے۔ جب ۴۱۰ء میں روم کو شکست فاش ہوئی تو عیسائیت کے لئے یہ لمحہ نہایت ہی اندوہ ناک تھا۔ اس شکست کی ذمہ داری بت پرستوں نے دین مسیحی پر ڈالی اور کلیسا نے اپنا پورا زور قلم اس کی تردید میں صرف کر دیا۔ سینٹ آگسٹائن نے مشہور کتاب "سٹی آف گاڈ" (City of God) تحریر کی جس میں روم کے سقوط کی یہ توضیح کی کہ روم کا مشرک دور ختم ہو گیا اور اب ایمان کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اسے مسیحی شہر ہونے کا جو اعزاز میسر آیا ہے وہ ابد تک قائم رہے گا۔ یہی وہ مفکر تھا جس نے آسمانی بادشاہت کی تاویل چرچ سے کی۔ گویا رومن امپائر کی جگہ چرچ نے لے کر انجیل کی آسمانی بادشاہت قائم کر دی۔ اسی عقیدۂ دوام کا یہ اثر تھا کہ مغرب کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ سلطنت روما کے کھوئے ہوئے علاقوں کو از سر نو عالم عیسائیت میں شریک کیا جائے۔[3] جنگ صلیبی، ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج، مسلم ممالک پر حملے اور اس صدی میں ترکی پر یورش سب ہی واقعات اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔

مغرب کے احساس برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنت روما کے اختتام کے بعد نشاۃ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدر مذہب تھی۔ اس دور میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا۔ مغرب پر شمال وحشی قبائل کی یلغار عہد وسطی میں مسلسل جاری رہی لیکن ان سب کو چرچ بتدریج عیسائیت میں جذب کرتا رہا۔

1 — 2, Cited by Toynbee A. J. In a Study of HistoryP. 4 Vol. IV

3. Nick Earl 'Culture and Creed London 1967

4 Grunebaum G E 'Medieval Islam . P. 62 - 2nd Edn. Chicago. 1953

عیسائیت قبول کرنے کے بعد ان حملہ آوروں کو مغربی عیسائی دنیا کا شہری تسلیم کر لیا جاتا۔ گویا نسل، وطن اور قومیت کا یہاں کوئی وجود نہ تھا۔ یہ سب عناصر مذہب کے آگے بے معنی تھے۔ صرف عیسائیت ہی وہ معیار تھی جس کی بنا پر مغرب کی شہریت میسر ہو سکتی تھی۔ مغرب میں عیسائیت کے قیام اور دیگر مذاہب کو ختم کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ رومن عہد میں جبری تبدیلی مذہب کا لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ بت پرستی کو چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین نے قانوناً ممنوع قرار دیا ۳۱۵ء میں تھیوڈوسس نے پورے مغرب میں ہر قسم کے مشرکانہ مذاہب پر پابندی لگائی تھیوڈوسس ثانی نے غیر عیسائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ لیو نے قانون کا پیشہ غیر عیسائیوں کے لئے ممنوع قرار دیا۔ جسٹینین نے تعلیم کے عہدے صرف عیسائیوں کے لئے مختص کئے اور اس نے اخر ش ۵۲۹ء میں حکم جاری کیا کہ ہر مشرک یا تو بپتسمہ لے ورنہ اس کا مال و متاع ضبط کر کے اسے ملک بدر کیا جائے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں پوپ گریگوری نے اطالیہ اور سسلی میں کچھ غیر عیسائی اقلیتیں پائیں جو گورنروں کو اپنی مذہبی آزادی قائم رکھنے کے لئے باقاعدہ سالانہ جزیہ پیش کرتی تھیں[1] جسے مغربی مؤرخین (Douccuy) کا نام دیتے ہیں

رومن عہد کے بعد مغربی عہد میں اس جبری تبدیلی مذہب میں مزید شدت نظر آتی ہے۔ شارلیمن کے عہد میں غیر عیسائی کے لئے صرف دو ہی صورتیں تھیں۔ عیسائیت یا موت[2]۔ اس جبری تبدیلی میں صرف حکومت ملوث نہ تھی بلکہ کلیسا بھی برابر کا شریک تھا اسی کے ایما پر حکومتوں نے یہ اقدامات کئے۔ پوپ گریگوری اوّل نے غیر عیسائیوں کو جنگ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تحریک چلائی[3]

چرچ کے دور اقتدار میں کسی فرد کے لئے عیسائیت سے انکار یا بپتسمہ لینے کے بعد قانوناً کلیسا سے گریز ممکن نہ تھا ایسا کرنا نہ صرف کلیسا بلکہ حکومت اور معاشرے سے بغاوت کے مترادف تھا۔ کلیسا سے سرکشی کا نام بدعت تھا اور بدعت اس دور

---

1. Jones A.H.M. 'The Decline of The Ancient World P - 323.
2. Ibid - P 322
3. K. E. Grunebaum 'Islam' P - 129 Oxford 1969

کا سب سے بڑا جرم - بدعت کا احاطہ نہایت ہی وسیع تھا اس کا اطلاق مذہب فکر، رسم و رواج ، علم و عمل ہر شے پر تھا -

بدعت کے نام پر مغرب نے انسانی معاشرے پر جو مظالم کئے ہیں وہ عدم رواداری کی بدترین مثال ہیں - سیکسن قوم کا قتل عام صرف اس سبب سے ہوا کہ وہ عیسائی نہ تھے - حروب صلیبی دو سو سال تک لڑی گئیں جن میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں - انا بپٹسٹ (Anabaptists) فرقے کا قتل عام - پروٹسٹنٹ فرقے کا قتل عام فرانس میں سینٹ بارتھولومیو (Saint Bartholomew) کا قتل عام - پھر چالیس سالہ خوں ریزی جو فرانس میں فرانسس اوّل کے عہد سے ہنری چہارم کے عہد تک ہوئی - اس پر مذہبی داروگیر کے نام پر صدیوں لوگوں کو کلیسا کی عدالت نے قانون بدعت کی آڑ میں موت کے گھاٹ اتارا - بیس سال پوپ کے خلاف پوپ کے نزاع کے نتیجے میں خون ریزی - نئی دنیا میں صلیب کے سائے تلے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کا قتل عام - اسپین میں ایک ایسی قوم کا قتل عام جو وہاں آٹھ سو سال سے بس رہی تھی جس نے ملک کی حالت بدل دی تھی اور جو عہد حاضر کی اوّلین معمار تھی - اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ عیسائی نہ تھی -

جرمنی میں کسانوں کا قتل عام اور البی جنسس (Albigenses) یا کتھارس (Cathars) فرقے کا قتل عام ، غرضکہ مذہب میں جبر و قوت کا استعمال عام و طیرہ رہا ہے - پانچویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک عیسائیت کے عقائد کی ترویج اور حفاظت دونوں کے لئے قوت و جبر کا بے دریغ استعمال کیا گیا یہاں تک کہ مغرب میں سوائے رومن کیتھولک کوئی دوسرا عقیدہ باقی نہ رہ گیا - مغرب میں مذہبی رواداری کے عدم وجود کو اس دور کے بیشتر اصحاب قلم تسلیم کرتے ہیں[1] وہاں کسی غیر کیتھولک اقلیت کا وجود نہیں پایا جاتا - اسپین کی تباہی اس عدم رواداری کی داستان ہے -

مغرب کی خودستائی صرف تاریخ ، معاشرت و تمدّن کے شعبوں تک محدود نہیں

---

1 - J. B. Trend, Art, 'Spain, Portugal, In the Legacy of Islam, P - 4. Oxford University Press 1960.

بلکہ اس سے مذہب بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی نظر میں رومن کیتھولک ہی حقیقت عظمیٰ کا حامل ہے۔ مغرب سے باہر کے تمام مذاہب حقانیت سے بیگانہ، باطل اور چربہ ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں مذہب کا شرارہ ایشیا کی سرزمین فلسطین سے ملا ہے۔ اسے بھی نہ صرف اپنی ہی تہذیب کا جزو تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وہ حقیقت جو ان کے دعوے کے منافی ہو اسے جھٹلاتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ نہ معلوم کیا مجبوری تھی کہ مغرب نے عہد نامہ قدیم کو بھی اپنی دینی کتاب تسلیم کیا ورنہ عہد نامۂ قدیم تو پورا کا پورا شامی عنصر ہے۔ اس کا ہر کردار، ہر مقام اور ہر ماحول شامی ہے۔ اس کے تصورات، تعلیم اور اخلاق سب ہی کچھ غیر مغربی ہے۔

حیرت ہے کہ مغرب نے اپنی کوئی "گاسپل" مدوّن نہ کی۔ مغرب کے مروجہ کیتھولک مذہب اور عیسائی مذہب میں کس قدر بعد ہے اس کا اندازہ اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب صرف اپنے مذہب کو عیسائیت تصور کرتا ہے اور دنیا کے دیگر عیسائیوں مثلاً نسطوری، مونوفزائٹ (Monophysits) اور آرتھوڈکس کرسچین کو وہ بدعتی تصور کرتا ہے۔

پس نسل و رنگ کے ساتھ رومن کیتھولک ہونا ایک امتیاز ہے۔ دور جدید میں ان سب سے بڑی جو ایک اور قدر سرمایہ داری نظام نے پیدا کی وہ قومیت ہے۔ قومیت نے عالم عیسائیت کو قومی خطوں میں بانٹ دیا۔ اب "کرسچین کامن ویلتھ" نام کی کوئی شے نہیں رہ گئی ہے۔ قومیت کا تصور حالیہ ہے جو ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں تفریق پیدا کر کے انہیں علاقائی وحدت بنا دیتا ہے۔ اس قومیت نے نہ صرف خطے، زبان اور آبادی کو ایک دوسرے سے جدا کیا بلکہ کلیسا کو بھی تقسیم کر کے چرچوں کی بنا ڈالی جس کے سبب مغرب کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور جنگ برادر کشی کے دور میں داخل ہو گیا۔

متذکرہ بالا اقسام کی احساس برتری کے سبب مغرب کی نظر میں دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔ دیگر اقوام کو کمتر قرار دینے کی حسب ذیل چار وجوہ مقرر کی ہیں[1]۔

---

1. TOYNBEE. 'A Study of History' P. 226, Vol. VI

۱ - بت پرست (Heathen)

۲ - غیر مہذب (Barbarian)

۳ - مقامی (Native)

۴ - کم نسل (Racial Inferior)

اور ان چاروں کی آڑ لے کر وہ دُنیا کی ہر قوم کو کسی نہ کسی طرح کم تر قرار دے لیتی ہے ان کے انسانی حقوق کا انکار کرنے سے انسانیت کی تمام اقدار مجروح ہوتی ہے غرضکہ مغربی خصوصیات میں رنگ و نسل کا امتیاز۔ مغربی وطنیت اور دیگر مذاہب کو برداشت نہ کرنا شدت کے ساتھ واضح ہیں۔ دور وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کے تحت ہر قدر سے زیادہ اہم مذہب تھا۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مقصد صرف مذہب کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔ ریاست کی تعریف اس دور میں یہ تھی کہ حقیقی ریاست وہ ہے جہاں سچے مذہب کی تعلیم دی جاتی ہو اور عقائد کی حفاظت ہوتی ہو

> The Christian Fathers and with special forcefulness augustine, insisted that a just State is one in which the True Religion is taught i.e., Since the Advent of Christianity only A Christian State can be just, The Chief purpose of the Government of this State must be contributing to Human Salvation by preserving The Purity of Faith.

اس طرح فرد ریاست اور حکومت سب ہی صرف مذہب کے لئے وقف تھے اور مذہب سے مراد آفاقی حقائق نہ تھے بلکہ رومن کیتھولک عقیدہ تھا۔ مغرب اپنے مذہب کو سارے ادیان عالم سے برتر تصوّر کرتا تھا۔ صرف ان ہی کا مذہب حق تھا اور اس کے سوا سب باطل۔ صرف اسی میں رُوحانیت تھی جس کا شائبہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا۔ صرف رومن کیتھولک ہی مذہب نجات تھا جو رُوحانی تزکیہ کرتا اور یہ خصوصیت کسی اور مذہب یہاں تک کہ کسی اور کلیسا میں بھی نہ پائی جاتی تھی۔ مغرب سے باہر کی دُنیا غیر متمدن اور وحشی تھی جس کی کوئی قدر قابل احترام نہ تھی۔

مغرب صرف ایک علاقہ اور معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے اس کی تعمیر میں ماضی کی کئی تہذیبوں نے حصّہ لیا۔ یہودی تہذیب سے مذہب مستعار لیا۔ یونانی

(باقی صفحہ پر)

1. G.E. Grunebaum. Islam' P. 130, Oxford University - Press, 1969.

سیرت وسوانح

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور ادب عربی

نصرت علی اثیر

آپ ایک جید عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم ادیب اور شاعر بھی تھے۔ آپ نے مختلف علوم پر کئی ایک کتب تصنیف کیں۔ جن کو عربی ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، زہد، جہاد اور اخلاق آپ کے نمایاں موضوع تھے۔ حدیث میں "اربعین" نویسی کا آغاز آپ نے ہی کیا۔

محمد بن جعفر الکتانی لکھتے ہیں: [1]

والاربعون لعبداللہ بن المبارک الحنظلی، وھو اول من صنّف فی الاربعینات۔

اسی طرح جہاد پر بھی آپ نے ہی سب سے پہلے تصنیف کی۔

کتانی لکھتے ہیں۔ [2]

والجھاد لابی عبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارک بن واضح ... من تابع التابعین، الحافظ احد الاعلام المتوفی بھیت وھی مدینۃ علی الفرات سنۃ احدی واثنتین وثمانین ومأتہ، وھو اول من صنف فی الجھاد۔

عربی ادب میں یہ کتب گراں قدر اضافہ تھیں۔ اس کے علاوہ آپ نے عربی شاعری میں زہد، جہاد، شخصیات، اخلاق حسنہ اور علم کی فضیلت پر مختلف انداز میں اعلیٰ قسم کے شعروں کا اضافہ کیا۔ آپ کی شاعری دعوت وتعمیر سے عبارت تھی۔ آپ نے تنقید وتوصیف

---

[1] محمد بن جعفر الکتانی، الرسالۃ المستطرفۃ: ۸۲: مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء

[2] ایضاً ص ۴۲